بسر ظہور احمد اظہر

ابوعطاء السندی

سرزمین سندھ برصغیر میں ملت اسلامیہ کی تاریخ کا باب اول اور نقطۂ آغاز ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جہاں کی ایک ریاست کے ایک حکمران نے یہ خیال کرتے ہوئے سرکشی و تمرد اختیار کیا تھا کہ مظلوم انسانیت کی آہ و فریاد قید خانوں سے باہر نہیں نکل سکتی مگر اس کا یہ خیال ایک خواب ثابت ہوا اور دیکھتے دیکھتے ہی وہ اور اس کی ریاست تاریخ کا ایک قصہ پارینہ بن گیا۔ مجاہدین اسلام نے بت کدۂ ہند میں قدم رکھ کر نہ صرف ان مظلوموں کو رہائی دلائی جن کی آواز پر حجاج لبیک کہتے ہوئے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر جرار تیار کرکے بھیجا تھا بلکہ یہاں اسلام کی شمع ہدایت بھی روشن کردی جس کی ضیا پاشیاں آج تک جاری ہیں اور انشاء اللہ جاری رہیں گی۔

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ جس دور میں اسلام اور عربی زبان نے سرزمین سندھ میں قدم رکھے تھے اس زمانے میں اسلام اور عربی زبان اندلس میں بھی داخل ہوئی تھی مگر اندلس جتنا سرزمین عرب سے دور تھا اتنا ہی زیادہ عربی زبان و ادب کو وہاں فروغ حاصل ہوا، اور وہاں کے شعراء، ادباء، اور علماء نے بغداد اور کوفہ کے علماء و ادباء کا ہر علمی میدان میں مقابلہ کیا لیکن سندھ و ہند کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ خطہ عرب دنیا سے بہت قریب تھا مگر عربی آداب اور علوم نے وہ آن بان یہاں نہیں دکھلائی جو اندلس میں نظر آتی ہے اور اس کے چند خاص اسباب تھے۔ عربوں کو جو کشش اندلس میں نظر آئی وہ سندھ میں نہ آئی اور یہاں عرب فوج در فوج داخل نہیں ہوئے جس طرح اندلس میں عربوں کے قبائل وہاں جاکر آباد ہوتے رہے، اور اپنے اپنے قبیلے کے نام پر بستیاں آباد کرتے رہے جو آج بھی ان کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔ اموی سلطنت کے زوال کے بعد عربوں نے تسخیر ہند کا خیال یا تو دل سے نکال دیا تھا اور یا پھر مصلحتاً کچھ عرصے کے لیے ترک کر دیا تھا۔ بنو عباس نے اسلامی خلافت کی حدود وسیع کرنے کی کبھی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی مصلحت

اسی میں تھی کہ مفتوحہ علاقوں میں اپنے قدم مضبوطی سے جماتے جائیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ سندھ ہند بھی اندلس کی طرح کسی اموی شہزادے کی پناہ گاہ بن جائے اور ان کا ایک اور حریف پیدا ہو اس لیے سندھ میں نہ تو کوئی مستحکم عرب حکومت قائم ہوسکی جو مقامی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے بعد باقی ہندوستان کو فتح کرتی اور نہ ہی کبھی یہاں کوئی عربی دربار ایسا تھا جہاں کی سرکاری زبان عربی ہوتی اور جہاں عرب شعراء ادبا کا استقبال کیا جاتا۔ اگر کوئی اموی شہزادہ عبدالرحمن اندلس کی طرح سندھ میں بھی داخل ہوتا اور یہاں بھی کوئی قرطبہ ایسا دربار لگتا تو اس خطے میں عربی ادب کی تاریخ یکسر مختلف ہوتی۔ بہرحال اگرچہ سندھ عربی ادب و زبان سے پوری طرح فیض یاب نہ ہوسکا لیکن اسے یہ فضیلت حاصل ہے کہ یہاں کی سرزمین اسلام سے خوب سیراب ہوئی مگر اندلس تو عربی کے ساتھ اسلام سے بھی محروم ہوگیا۔

اس خطے کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے وہ دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو مقامی طور پر مسلمانوں کے حسن سلوک سے متاثر ہوئے اور بطیب خاطر اسلام قبول کر لیا دوسرے وہ لوگ جو جنگی قیدیوں کی حیثیت سے سرزمین عرب لے جائے گئے، اور انھوں نے یا ان کی اولاد نے اسلام قبول کر لیا۔ عربی ادب اور اسلامی علوم میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا وہ زیادہ تر اسی موخرالذکر گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا شاعر ابو عطاء السندھی بھی اسی گروہ سے تھا اور کہا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ اور امام اوزاعی کے آبا و اجداد بھی سندھی جاٹ (زُط) تھے۔ بہرحال برصغیر میں یہ فخر تنہا سندھ کو حاصل ہے کہ اس نے عربی زبان کا ایک بلند پایہ شاعر پیدا کیا جو عربی ادب کی تاریخ میں عظیم شعرا کی صف میں شمار ہوتا ہے، اور جس کا کلام عرب لغت نویسوں اور نحویوں نے حجت تسلیم کیا ہے اور اسے بطور استشہاد و استناد پیش کیا ہے۔

نام و نسب

ابو عطا کے خاندان کے حالات تاریکی کے پردوں میں گم ہیں حتیٰ کہ اس کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ ابن قتیبہ کا خیال یہ ہے کہ اس کا نام مَرزُوق تھا اور وہ اسد بن خزیمہ کے موالی میں سے تھا، ابوالفرج الاصفہانی اور ابو عبید البکری کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام اَفلح تھا اور اس کا باپ یَسار ایک سندھی الاصل عجمی تھا، اور اسی رائے کو زیادہ تر پسند کیا جاتا ہے۔

بہرحال نام کچھ بھی ہو وہ اپنی کنیت سے ہی مشہور ہے۔ ابو عطا کو ایک ممدوح نے ایک غلام بخش دیا تھا جس کا نام عطا تھا، ابو عطا نے اسی غلام کے نام سے اپنی کنیت اختیار کر لی اور یہی غلام اس کا کلام پڑھ کر سنایا کرتا تھا اور سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ابو عطا کی عادات و اطوار کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ وہ سندھ کی بہادر اور غیور قوم جاٹ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا باپ ان جنگی قیدیوں میں سے ہوگا جو حروب سندھ میں گرفتار ہوئے اور دیار عرب میں غلاموں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔

تاریخی ماخذ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ابو عطا نے کوفہ میں ایک غلام کی حیثیت سے نشوو نما پائی اس دور میں غلاموں کو تربیت دینے اور انھیں علم و ادب سے آراستہ کرنے کا رواج عام ہو چکا تھا۔ بعض تاجر تو غلاموں اور لونڈیوں کی تربیت اس غرض سے کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمایا جا سکے، اور بعض لوگ تفنن طبع کے طور پر اپنے غلاموں کو تربیت دیتے تاکہ معاشرے میں اور گھر آنے جانے والے مہمان کے ساتھ سلوک کرنے میں وہ ایک مہذب و مؤدب انسان کا سا برتاؤ کر سکیں، ابو عطا کی تربیت بھی اسی رنگ میں ہوئی۔

ابو عطا کے زمانے کا کوفہ علوم و آداب کا مرکز بن چکا تھا اس لیے وہ بھی اس علمی ماحول سے پوری طرح بہرہ ور ہوا، اسے جزیرۂ عرب کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی حالات کا بخوبی علم تھا، اس کا اندازہ اس حکایت سے ہو سکتا ہے جو ابو عطا اور حماد الراویہ کے درمیان یحییٰ بن زیاد الحارثی کے مکان پر پیش آئی تھی۔ علمائے کوفہ کی صحبت سے ابو عطا جہاں عربوں کے احوال اور ان کی تاریخ سے آگاہ ہوا وہاں اس نے عربی زبان اور ادب پر بھی عبور حاصل کیا اور باوجود عجمی نژاد ہونے کے اپنے زمانے کے عرب شعرا میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا۔

ابوالفرج اصفہانی کی ایک روایت کی رو سے ابو عطا کو اس کے آقاؤں نے خود بخود آزاد نہیں کیا تھا بلکہ مکاتبت کے ذریعہ اپنی قیمت کما کر آقاؤں کو دی اور اس طرح آزادی حاصل کی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے اور وہ یوں کہ جب ابو عطا نے ایک شاعر کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی اور مال و دولت میں اضافہ ہو گیا تو اس کے آقا عنبر الاسدی نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابو عطا تو اس کا ابھی تک غلام ہے لہٰذا اس کی تمام دولت اور جان کا وہ مالک ہے۔

ابوعطا نے اپنے احباب سے اپنے سابق آقاؤں کے لالچ اور بدنیتی کا شکوہ کیا اور ان کے مشورہ سے اپنے آقا سے معاوضۂ مکاتبت طے کر لیا جو چار ہزار درہم تھا۔ کوفہ کے اہل علم و ادب اور ابوعطا کے دوستوں نے امداد کا وعدہ کیا مگر ابوعطا کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے اپنے زمانے میں کوفہ کے ایک مشہور صاحب جود و سخا حُر بن عبداللہ القرشی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس قصیدے میں ابوعطا بڑے اخلاص اور صاف گوئی سے کام لیتا ہے اور حُر کو مخاطب ہو کر کہتا ہے:

اَتیتُکَ لامن قربۃ ھی بیننا ولانعمۃ قد متھا استثیبُھا

میں تیرے پاس کسی سابقہ قرابت اور نعمت کی بنیاد پر فریادی بن کر نہیں آیا کہ اس کے معاوضے میں کچھ طلب کروں بلکہ بغیر کسی سابقہ قرابت کے تجھ سے امید ہے۔

چنانچہ حر نے اس کی منہ مانگی رقم ادا کر دی اور یوں ابوعطا اپنے ایک قصیدے کے بدلے آزاد ہو گیا۔

ابوعطا آزاد تو ہو گیا مگر اسے اپنے آقا کی بدنیتی اور عیاری سے سخت صدمہ ہوا اور اس سے انتقام لینے کی ٹھان لی اور ایک قصیدہ ہجو یہ لکھ کر اس کی کمینگی کو "غیر فانی" بنا دیا۔

ابوعطا کی ایک مشکل

ابوعطا نے عربی زبان اور ادب پر خوب عبور حاصل کر لیا تھا اور عربوں کی تاریخ سے بھی اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ ایک مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا اور وہ ہے اس کی زبان کی لکنت۔ وہ ج کو ز اور ش کو س پڑھتا تھا، اور عربی حروف مثلاً ح، ع، ق اور ط کو اپنے صحیح مخارج سے ادا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا یہ نقص دوست احباب کے دلچسپ مذاق کا سامان پیدا کرتا تھا لیکن ابوعطا کی غیرت و حمیت اور غیظ و غضب سے سب خائف رہتے تھے۔

محمد النوفلی کا قول ہے کہ ایک مرتبہ ابوعطا نے سلیمان بن مجالد کی شان میں قصیدہ لکھا اور اپنے غلام عطا سے کہا کہ امیر کو پڑھ کر سناؤ۔ غلام نے ایک شعر میں ایک نحوی غلطی کی جس سے شعر کا مطلب خبط ہو گیا، ابوعطا غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور اس سے کہا کہ تیرا ناس ہو تو نے میرے شعر کا

علیہ بگاڑ دیا ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں نے امیر کی مدہ (مدح) کے بجائے ہزو (ہجو) کہی ہے (ما مدهته إنما هزوته - ما مدحته انما هجوته) اور جوش میں آکر شعر کو خود دُھرایا اور اب ایک نحوی غلطی کی بجائے غلط تلفظ اور لحن کا ایک طوفان اُمڈ آیا اور سب کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ رہے تھے مگر کسی کو کھل کر ہنسنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یحییٰ بن زیاد الحارثی اور حماد الراویہ عربی ادب کے بہت بڑے علما اور شعر کے ممتاز راویوں میں سے تھے۔ ان دونوں کی مُعلی بن هبیرہ سے بڑی چشمک اور نوک جھونک کا سلسلہ رہتا تھا۔ مُعلی بن هبیرہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ کسی ہجو گو شاعر کو حماد کے پیچھے لگا دیا جائے اور وہ ہجو گوئی سے اسے ذلیل اور رسوا کرے۔ ایک دن یہ تینوں یحییٰ بن زیاد کے گھر پر جمع تھے مُعلی کو ایک شرارت سوجھی اور حماد سے کہا: لطف کی بات تو تب ہے کہ ابو عطاء السندھی کی لکنت کا تماشہ دکھاؤ اور اس کی زبان سے کسی طرح یہ الفاظ کہلواؤ: زج (نیزے کی انی) جرادہ (ٹڈی) اور بنو شیطان۔ حماد نے کہا: اگر میں نے کہلوا دیا تو کیا دو گے؟ معلی نے کہا: میں اپنی خچر مع لگام اور زین تمھاری نذر کروں گا۔ چنانچہ باقاعدہ عہد و پیمان تحریر کیا گیا اور جب بات پکی ہو چکی تو ابو عطا کو بلا بھیجا گیا۔ ابو عطا نے آتے ہی اپنی لکنت کا مظاہرہ شروع کر دیا اور ان تینوں کو دیکھ کر بولا: مرهبا مرهبا هیاکم الله (مرحبا مرحبا حیاکم الله)۔ ابو عطا کو شام کا کھانا پیش کیا گیا تو بولا: لاهاجة لی (لاحاجة لی: مجھے اس کی حاجت نہیں)، ہاں البتہ نبیذ پلا سکو تو مضائقہ نہیں۔ ابو عطا نے جو نبیذ چڑھانا شروع کی تو پیتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ آنکھیں سرخ ہو گئیں، جسم ڈھیلا پڑ گیا اور اس پر ایک عجیب وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو گئی۔

حماد الراویہ نے اس کیف و مستی کے عالم کو غنیمت جانتے ہوئے ابو عطا سے کہا: یار ابو عطا ہمیں ایک شخص نے عجیب و غریب مشکل میں ڈال دیا ہے، اور ایک معما کی شکل میں ہمیں چند شعر لکھ بھیجے ہیں اور ان کا جواب طلب کیا ہے مگر میں تو باوجود کوشش کے ان کے جواب سے قاصر رہا ہوں اگر تم میری مدد کر سکو تو شکر گزار رہوں گا۔ ابو عطا فوراً بول اٹھا: لاؤ تو دیکھتا ہوں کون سے اسرار و رموز ان میں بند ہیں۔ حماد نے یہ شعر پڑھا:

فما اسم حديدة في رأس رمح   دوين الكعب ليست بالسنان؟

ترجمہ: اس لوہے کا کیا نام ہے جو نیزے کے سرے پر ہوتا ہے اور اس پر سنان کا اطلاق بھی نہیں ہوتا

ابوعطا نے فی البدیہہ جواب دیا:

هو الزُّج الذي إن بات ضيفاً لصدرك لم تزل لك عولتان

ترجمہ: وہ زُج (زج نیزے کی انی) ہے کہ اگر نیزے سینے میں گھس جائے تو چلانا رہ جائے۔

حماد نے کہا: خدا تمھارا بھلا کرے تمھارا مطلب ہے زج اچھا تو بتاؤ:

فما صفراء تدعى ام عوف كأن رجيلتيها منجلان

ترجمہ: وہ پیلے رنگ کی مخلوق جسے ام عوف بھی کہا جاتا ہے اور اس کی ٹانگیں درانتی کی مانند ہوتی ہیں کیا چیز ہے؟

ابوعطا نے جواب دیا:

أردت زرادة وأظنه زنا بأنك ما أردت سوى لساني

ترجمہ: تمھارا مطلب جرادہ (مکڑی) سے ہے اور میرا خیال ہے تم میری لسانی لکنت کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے۔

حماد نے جواب دیا: ابوعطا خدا تمھارا بھلا کرے تم کہنا چاہتے تھے:

جرادة واظن ظنا (زرادة واظنه زنا) بس اب صرف اتنا بتا دو کہ:

اتعرف مسجداً لبني تميم فويق الميل دون بني تميم

ترجمہ: کیا تمھیں بنی تمیم کی کسی ایسی مسجد کا علم ہے جو مقام میل سے اوپر اور دیار بنی تمیم سے ادھر واقع ہے؟

ابوعطا نے کہا:

بنو سيطان دون بني ابان كقرب ابيك من عبد المدان

ترجمہ: اس مسجد کو بنو سیطان (بنو شیطان) کہتے ہیں اور وہ دیار بنی ابان کے اتنی ہی قریب ہے جتنا تمھارا باپ بنی عبد المدان کے قریب تھا۔

حماد کا بیان ہے کہ یہ شعر پڑھتے ہی ابوعطا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور میں ڈرنے لگا۔ میں نے کہا: ابوعطا میں تمھاری پناہ میں آتا ہوں لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس فریب دہی کے بدلے میں مجھے جو کچھ ملا ہے اس میں سے آدھا تمھارا۔ ابوعطا یہ سن کر چونک پڑا اور کہا، حماد

سچ سچ بتا دو یہ قصہ کیا ہے؟ میں نے تمام کہانی سنا دی اور ابو عطا بولا: میں نے تمھیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے، تم میری زبان سے محفوظ ہو گئے اور یہ مال بھی تمھارا ہے جاؤ عیش کرو . . . . . مگر میں اس کو اس کی شرارت کا خوب مزہ چکھاؤں گا اور . . . . . یوں معلی بن ھبیرہ حماد کو پھنسانے پھنساتے خود ابو عطا کی ہجو گوئی کا نشانہ بن گیا۔

یہ واقعہ جہاں دلچسپ ہے وہاں ابو عطا کی لکنت اور لہجے کے نقائص کو ظاہر کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی غمازی کرتا ہے کہ ابو عطا کے معاصر اس کی لکنت سے کس طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے تھے اور یہ بھی کہ اسے دیارِ عرب کے جغرافیائی حالات اور عرب قبائل کے انساب سے کتنی گہری واقفیت تھی۔

ابو عطا کا سیاسی مسلک

ابو عطا بنو امیہ کے شعرا اور ان کے اعوان و انصار اور والہانہ محبت کرنے والے مداحوں میں سے تھا۔ اس نے گو بنو عباس کا زمانہ بھی پایا تھا مگر وہ ہمیشہ ان کا مخالف رہا۔ اس کی وجہ ایک تو غیور جاٹ کا اخلاص اور محبت تھی جو اپنے دشمنوں اور بہی خواہوں کو وقتی ضرورتوں کے پیشِ نظر دل سے نکال کر دوسروں کو ان کی جگہ بمشکل ہی دے سکتے ہیں، اور دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کی سرد مہری ہے۔

ابو عطا کی حُبِّ بنی امیہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ان جنگوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو بنو امیہ اور بنو عباس کے درمیان ہوتی رہیں اور انہی جنگوں میں ابن ھبیرہ کے ساتھ اس کا غلام عطا بھی مارا گیا تھا اور ابو عطا خود شکست کھا کر بچ نکلا تھا۔

ان جنگوں کے دوران میں ایک بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل ابو الفرج نے کتاب الاغانی میں پیش کی ہے۔ ابو عطا جب بنو عباس کی فوجوں کے خلاف لڑ رہا تھا تو اس کے ایک ساتھی ابو یزید المریّ کا گھوڑا مارا گیا اور ادھر عباسی فوجیں فتح کے نقارے بجانے والی تھیں اور اموی فوج کے کسی سپاہی کے بچ نکلنے کی امید بہت کم نظر آتی تھی۔ ابو یزید نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے ابو عطا سے کہا: لائیے اپنا گھوڑا مجھے دے دیجیے، میں اپنی اور آپ کی طرف سے دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ ابو عطا نے اس کی باتوں میں آ کر گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔ ابو یزید گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔ اب ابو عطا بے چارے کے پاس کیا

تھا؟ جوں توں کر کے جان تو بچالی مگر ابو یزید المری پر ہجو کے تیر و نشتر برسانے کی ٹھان لی اور دھوکہ باز فراری سپاہی اور اس کی قوم کے لیے ذلت و عار کا ابدی سامان پیدا کر دیا۔

معلوم ہوتا ہے ابو عطا نے نامساعد حالات سے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ بنو عباس سے مالی فوائد حاصل کرنے کی کوشش بھی کی مگر کامیاب نہ ہو سکا اور آخری دم تک اموی مسلک پر قائم رہا۔ اس نے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کی مدح میں شعر کہے مگر ایک تو وہ بڑا کنجوس واقع ہوا تھا شاعروں سے پیچھا چھڑانے کے بہانے سوچتا رہتا تھا اور صرف خاص حالات میں عطیات دیتا تھا دوسرے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ابو عطا دل و جان سے بنو امیہ سے محبت کرتا ہے اس لیے اسے کچھ نہ دیا۔ ابو عطا نے ایک اور قصیدہ مدحیہ لکھا مگر منصور نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جس شاعر نے دشمنِ خدا فاسق و فاجر نصر بن سیار کی مدح کی ہو اور مرثیہ لکھا ہو اسے میں کبھی منہ نہیں لگاؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد ابو عطا عباسیوں سے قطعاً مایوس و نا امید ہو گیا اور ان کی ہجو میں کئی ایک قصیدے کہہ ڈالے۔ مثلاً وہ اسی سلسلے میں ایک موقع پر کہتا ہے:

فلیت جور بنی مروان عاد لنا   ولیت عدل بنی العباس فی النار

کاش بنو مروان کا ظلم و جور ہماری خاطر پھر لوٹ آتا اور بنو عباس کا انصاف جہنم میں جلا جاتا۔

ابو عطا اور ابو دلامہ

ابو دُلامہ ابتدائی عباسی دور کا ایک مسخرہ اور ظریف شاعر تھا۔ عباسی خلفا اور ان کی بیگمات کے ساتھ اس کے لطائف عربی ادب کی کتابوں میں بڑی شہرت و اشاعت رکھتے ہیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ اس ہزل گو شاعر کے ساتھ ابو عطا کے بھی اچھے تعلقات تھے اور دونوں ایک دوسرے سے مزاحیہ انداز میں چوٹیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ابو دلامہ کی ایک خچر تھی جو بہت دبلی پتلی اور لاغر تھی۔ ابو عطا کو جو شرارت سوجھی تو اس خچر کے بارے میں ایک قصیدہ کہہ ڈالا جس میں ابو دلامہ پر خوب طنز کیا۔ وہ اس خچر کو یہ مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو نے ابو دلامہ ایسے "مجسمہ سخاوت" پر بھروسہ کیا تو انشاء اللہ بھوک اور لاغری کی موت مرے گی۔ وہ کہتا ہے:

سلیه البیع واستعدی علیه   فانك ان تباعی تسمنینا

ترجمہ: ابو دلامہ سے کہہ کہ وہ تجھے فروخت کر دے اور اس پر نالش کر دے، کیونکہ فروخت ہو کر ہی تو موٹی تازی ہو سکے گی۔

ابو عطا کے ممدوحین

ابو عطا نے اموی دور کے کئی ایک سربرآوردہ اشخاص، اہل جود و سخا اور حکام کی مدح کی ہے۔ اس کے ان ممدوحین میں تین نام نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ان میں سے ایک تو سلیمان بن سلیم بن کیسان ہے جس سے وہ اپنی لکنت اور لسانی عیب کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے:

اعوزتنی الرواۃ یا ابن سلیم وابی ان یقیم شعری لسانی

ترجمہ: اے ابن سلیم مجھے شعر کے راویوں نے عاجز کر دیا ہے (میرے شعر کو روایت کرنے والے نہیں ملتے) اور میری زبان تو شعر کو صحیح طور پر ادا کرنے سے انکاری ہے)

سلیمان ابو عطا کی اس مدح سے بہت متاثر ہوا اور اپنا ایک فصیح و بلیغ غلام بخش دیا۔ جس کا نام اس نے عطا رکھا اور اسے ابو عطا نے اپنا بیٹا بنا لیا۔ اسی کے نام سے اپنی کنیت اختیار کی اور وہ اس کے لیے اندھے کی لاٹھی ثابت ہوا۔ سفر و حضر میں اس کے ساتھ رہتا، جب کسی ممدوح کی شان میں قصیدہ کہتا تو عطا اسے پڑھ کر سناتا تھا۔

سلیمان کے علاوہ ابو عطا کے ممدوحین یزید بن عمر بن ھبیرہ اور نصر بن سیار خصوصی اہمیت رکھتے ہیں، جو بنو امیہ کے آخری دور کے ممتاز قائد اور حاکم تھے۔ ان دونوں سے ابو عطا کا تعلق بڑا گہرا اور پختہ تھا اور بعض اوقات تو بڑی قرابت اور بے تکلفی کا رنگ لیے ہوئے تھا۔

ابو الفرج اصفہانی کے بیان کے مطابق ابن ھبیرہ دریائے فرات کے کنارے ایک شہر تعمیر کرا رہا تھا اور ابو عطا بھی اس کے ساتھ تھا۔ خاندان ابن ھبیرہ جود و سخا میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔ اس موقع پر ابن ھبیرہ نے ایک روز لوگوں کو اپنے عطیات سے خوب نوازا مگر ابو عطا کو ــــ غالباً دانستہ طور پر چھیڑنے کے لیے ــــ نظر انداز کر دیا۔ ابو عطا بھی بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور ابن ھبیرہ کی شان میں ایک قصیدہ

کہا جس میں وہ کہتا ہے:

فیا عجبا للبحر بات بیسقی　　جمیع الخلق لم یبلل لھاتی

ترجمہ: تعجب ہے کہ وہ سمندر جو سب مخلوق کو سیراب کرتا رہا میرے تالو کو بھی تر نہ کر سکا

اس پر ابن ھبیرہ نے کہا: ابوعطا تمھارا تالو کتنے میں تر ہوگا؟ اس نے کہا: دس ہزار درہم میں۔ چنانچہ یزید نے اپنے بیٹے سے کہا کہ ابوعطا کو دس ہزار درہم دے دو۔ عطیہ وصول کرنے کے بعد ابوعطا نے یزید کے بیٹے کی شان میں ایک قصیدہ کہا جس میں خاندان ابن ھبیرہ کی جود و سخا کی دل کھول کر مدح سرائی کی ہے وہ کہتا ہے:

اما ابوک فعین الجود نعرفه　　وانت اشبه خلق الله بالجود

لولا یزید ولولا قبله عمر　　القت الیک معد بالمقالید

ماینبت العود إلا فی ارومته　　ولا یکون الجنی الامن العود

(۱) جہاں تک تیرے باپ (یزید بن عمر بن ھبیرہ) کا تعلق ہے تو وہ، تو تجھے معلوم ہے کہ سرچشمہ جود و سخا ہے۔

(۲) اگر یزید اور اس سے قبل عمر نہ ہوتے تو قبیلہ معد خزانہ جود و سخا کی چابیاں تجھے سونپ دیتا

(۳) شاخ صرف اپنے تنے میں ہی اگ سکتی ہے، اور پھل حاصل کرنا بھی صرف شاخ جود و سخا سے ہی ممکن ہے۔

بنو عباس نے جب بنو امیہ کا تختہ الٹ دیا تو ابوجعفر منصور نے یزید بن عمر بن ھبیرہ کو معاف کر دیا اور امان لکھ دی تھی مگر پھر پچھتایا اور دھوکے سے اسے قتل کرا دیا۔ ابوعطا کو اس کا سخت صدمہ ہوا اور اس نے ابن ھبیرہ کا مرثیہ کہا جو عربی شاعری کے بہترین مرثیوں میں شمار ہوتا ہے اور ابوتمام نے اسے اپنے انتخاب دیوان الحماسہ میں جگہ دی ہے جس میں وہ کہتا ہے:

الا إن عینا لم تجد یوم واسط　　علیک بجاری دمعھا لجمود

ترجمہ: ہاں وہ آنکھ یقیناً بخیل و خسیس ہے جس نے واسط میں تیرے قتل پر آنسو نہ بہائے حالانکہ یہ آہ و بکا اور آنسو بہانے کا موقع تھا۔

نصر بن سیار خراسان کا اموی گورنر تھا۔ خراسان میں قیس و یمن کی باہمی چپقلش اور عباسی تحریک

کے ضمن میں اس کا نام اکثر آتا ہے۔ ابو عطا نے نصر بن سیار کی مدح بھی کہی اور اس کی وفات پر اس کا مرثیہ بھی لکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ابو جعفر منصور ابو عطا سے ہمیشہ اعراض کرتا اور اس سے شدید عناد رکھتا تھا، اور مدح سرائی کے باوجود ابو عطا کو اس کے دربار سے رسوا ہو کر نکلنا پڑا تھا۔

نصر بن سیار نے ایک دفعہ ابو عطا کو ایک خوبصورت لونڈی تحفہ کے طور پر دی۔ دوسرے روز صبح کو نصر نے ابو عطا سے قصہ شب کی روئداد کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگا: آج کی رات تو نیند نہ جانے کہاں بھاگ گئی تھی، میں نے اس سلسلے میں ایک شعر بھی کہا ہے ذرا ملاحظہ فرمائیے:

ان النکاح وان هربت لصالح خلف لعینك من لذیذ المرقد

ترجمہ: لذت نکاح خواہ کچھ بھی ہو، خواب شیریں کا نعم البدل ہے جو تمھاری آنکھوں کو شب بیداری کی شکل میں نصیب ہوتا ہے۔

سیرت و اخلاق

ابو عطا کی سیرت کی تشکیل میں دو عناصر کارفرما تھے۔ ایک طرف تو وہ نسلی اعتبار سے سندھ کے کسی جنگجو خاندان —— اغلباً جاٹ قوم —— سے تھا اس لیے اس کی شخصیت میں اکھڑپن، تیزی، غصہ اور رعب داب تھا اور دوسری طرف عربی و اسلامی ثقافت نے اس کی تربیت کی تھی۔ چنانچہ اس ثقافتی تربیت کے اثرات اس پر نمایاں تھے۔ وہ بڑا خوددار، زودفہم، زیرک، وفاشعار، بہادر اور غیور انسان تھا۔ اس کی غیرت و حمیت پر روشنی ڈالنے کے لیے ذیل کا واقعہ کافی ہوگا۔ ایک دفعہ اس کے ہاں ایک مہمان آیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد جب مشروبات کا دور چلا تو مہمان نے ابو عطا کی لونڈی کو بری اور حریصانہ نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابو عطا کی رگ غیرت و حمیت پھڑک اٹھی اور مہمان سے مخاطب ہوا:

کل هنیئاً وما شربت مریئاً ثم قم صاغراً وانت ذمیمٌ

لا احب الندیم یومض بالطرف اذا ما خلا لعرسی الندیم

(۱) میرے ہاں کا یہ کھانا پینا تمھارے لیے خوشگوار ہو۔ لیکن اس کے بعد ذلیل اور رسوا ہو کر یہاں سے دفع ہو جاؤ۔

(۲) میں ایسے ہم صحبت وہم نشین کو کبھی پسند نہیں کرسکتا جسے موقع ملے تو میری عزت پر بری وحریصانہ نظر ڈالنے لگے۔

وفات

ابو الفرج اصفہانی کے بیان کے مطابق ابو عطا نے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور کے آخری زمانے میں وفات پائی منصور کی وفات ۶ ذی الحجہ ۱۵۸ھ میں ہوئی۔ اس لحاظ سے ابو عطا کا زمانۂ وفات دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی کا عشرِ اول ثابت ہوتا ہے۔

شاعری

ابو عطا اپنے زمانے کے چوٹی کے شعرا میں سے تھا۔ ابو الفرج اصفہانی اور ابن قتیبہ ایسے عظیم نقاد اور اہل فن نے اس کے شاعرانہ جوہر کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ابو الفرج کہتا ہے: "وکان مع ذالک من احسن الناس بدیھۃ واشد ھم عارضۃ" کہ ابو عطا اپنی عجمیت اور لکنت کے باوجود بہترین بدیہہ گو شاعروں اور مقابلہ و معارضہ میں سخت ترین لوگوں میں سے تھا۔ ابن قتیبہ کے قول کے مطابق وہ عجمی ہو کر بھی بہترین شعر کہتا تھا (وکان جید الشعر وکانت فیہ عجمۃ)

ابو عطا نے اپنے دور میں مروجہ اصناف سخن میں تقریباً ہر صنف کے شعر کہے بلکہ اس کی شاعری دوسروں کی نسبت متنوع موضوعات پر مشتمل نظر آتی ہے۔ مدح و ہجا، غزل و تشبیب اور شجاعت و حماست کے عام موضوعات کے علاوہ اس نے مختلف مواقع اور مناسبات پر جو فی البدیہہ شعر کہے وہ ایک الگ موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مدح و ہجو اور دیگر اصناف کے نمونے گذشتہ سطور میں ضمنی طور پر مذکور ہو چکے ہیں لیکن اس کی غزل گوئی اور عشقیہ شاعری جس کے نمونے بہت ہی کم نظر آتے ہیں، کا اندازہ ان دو شعروں سے لگایا جاسکتا ہے جن میں وہ میدان جنگ میں موت کے منڈلاتے ہوئے سایوں میں اپنی محبوبہ کی یاد اور اس کی جادو بھری محبت کا تذکرہ کرتا ہے جہاں بڑے بڑے بہادر اپنی جان کے سوا سب خام خیالیاں بھول جاتے ہیں۔ بہادر عاشق کے یہ شعر ابو تمام کو اس قدر پسند آئے کہ اس نے انھیں باب النسیب (عشقیہ اشعار) کے بجائے باب الحماسۃ (بہادری سے لبریز اشعار) میں درج کیا ہے۔

ذکرتك والخطی یخطر بیننا   وقد نهلت منا المثقفة السمر

فوالله ما ادری وانی لصادق   اداءٌ عرانی من حبابك ام سحر

(۱) تو (اے محبوبہ) مجھے اس وقت یاد آئی جب خطی نیزے ہمارے سامنے لہرا رہے تھے اور سید ھے اور گندمی رنگ والے نیزے ہمارے خون سے سیراب ہو چکے تھے۔

(۲) بخدا مجھے کچھ معلوم نہیں البتہ بات بالکل سچ کہتا ہوں کہ مجھے یا تو تیری محبت کی بیماری نے آگھیرا ہے اور یا پھر مجھ پر جادو چھا گیا ہے۔

ابوعطا کی بدیہہ گوئی اور ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کا تقاضا ہے کہ اس کے اشعار کی تعداد کافی زیادہ ہوگی مگر افسوس کہ اس کا دیوان آج دنیا میں محفوظ نہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ابوعطا کے ان تمام اشعار کو حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق دیوان کی شکل میں مرتب کر دیا ہے جو تاریخ اور ادب کی کتابوں میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ کسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں ایک مقالے کی شکل میں شائع ہوئی تھی اور پھر پاکستان میں اسے مستقل کتاب کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ استاذ گرامی پروفیسر عبدالعزیز میمن صاحب نے دیوان کا مقدمہ فصیح و بلیغ عربی میں لکھا ہے جو بڑا مفید اور معلومات افزا ہے۔

حیاتِ محمدؐ

از محمد حسین ہیکل   مترجم: ابو یحییٰ امام خاں

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب اور محقق محمد حسین ہیکل کی مشہور و معروف تصنیف کا ترجمہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات نہایت موثر اور دل نشین انداز میں لکھے گئے ہیں اور حضورؐ کی حیات طیبہ کے ان پہلوؤں کو خصوصیت سے اجاگر کیا گیا ہے جن کا تعلق زندگی کے بنیادی حقائق اور اس دور کے اہم مسائل سے ہے۔ قیمت ۵۰ر۲۲ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور